



سکرتی زمین یا گھلتا آسمان: مذہبی اقلیتوں کے لیے طرز انتخاب کی بحث

تحریر: پیٹر جیکب

342

روزنامہ ایکسپریس ٹریبون کی اشاعت 26 اکتوبر 2017ء میں ہمارے دوست محترم سرور باری صاحب نے مذہبی اقلیتوں کے لئے موزوں طرز انتخاب پر جاری بحث میں حصہ لیتے ہوئے ایک تجویز دی ہے کہ قومی اسمبلی کے اُن 28 حلقوں میں جہاں مذہبی اقلیتوں کے 25 ہزار یا اس سے زیادہ ووٹر موجود ہیں، انہیں کثیر نمائندگی کے حلقے بنادیا جائے جن میں جنرل سیٹ کے امیدوار کے علاوہ اقلیتی مخصوص نشستوں پر بھی انتخاب ہو۔ تاکہ مذہبی اقلیتیں مخصوص نشستوں پر براہ راست انتخاب سے اپنے نمائندے منتخب کر سکیں۔ اس طرح کی کچھ اور تجاویز بھی سامنے آئی ہیں کہیں اقلیتی افراد کے لیے دوہرے ووٹ کی اور کہیں جنرل نشستوں پر حلقے مخصوص کرنے کی۔ تجاویز دینے والے احباب کی نیت پر شک نہیں۔ بظاہر یہ تجاویز معصوم لگتی ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو مخلوط انتخابات کی بحالی کے بعد سیاسی نظام کے اعتبار سے یہ تجاویز سفر معکوس ثابت ہو سکتی ہیں۔ آئیے پہلے پیش کردہ تجاویز کے عواقب کا جائزہ لیتے ہیں۔

1۔ یہ مفروضہ کہ ووٹر اور نمائندہ ہم مذہب ہوں تو بہتر سیاسی نمائندگی ہو سکتی ہے منطقی نہیں لگتا۔ دُنیا میں چند ہی سیاسی نظام ایسے ہوں گے جہاں اس مفروضہ کو اب بھی قابل عمل سمجھا جاتا ہے اور یہ ممالک سیاسی نظام کی کوئی درخشاں مثال نہیں ہیں۔ جنوبی ایشیا میں اس مفروضہ کو جب جب اور جہاں جہاں استعمال کیا گیا وہاں پر سیاست اور تمدن دونوں پر بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ سماجی رشتے تفریق کا شکار رہے۔ پاکستان کے حالیہ نظام میں بھی اس کا اطلاق ماضی کی آلائشوں کو دھونے کی غرض اور ایک عملی ضرورت کے ناتے سے ہو رہا ہے۔ ورنہ مذہبی بنیاد پر مخصوص نشستوں کی منطقی اور اطلاقی بنیادیں تو کمزور ہیں۔

2۔ اگر قومی اسمبلی کے 28 حلقوں کو کثیر نمائندگی کے حلقے بنانے کی تجویز پر عمل کر لیا جائے تو لامحالہ ان حلقوں کی پہچان اقلیتی مذاہب کے حوالہ سے ہو جائے گی۔ ممکنہ طور پر پنجاب میں کچھ حلقے مسیحی شناخت اختیار کریں گے تو سندھ میں کچھ حلقے ہندو کہلائیں گے۔ تو پہلا سوال یہ ہوگا کہ آیا مجوزہ طریقہ کار سے پنجاب کے مسیحیوں اور سندھ کے ہندوؤں کے لیے تحفظ اور ترقی کے امکانات یقینی ہو جائیں گے یا ان کو درپیش چیلنجز میں اضافہ ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ ملک کو ابھی دہشت گردی اور دھرنہ باز گروہوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں وقت لگ سکتا ہے اور ابھی تک ماضی میں اقلیتی آبادیوں پر ہونے والے حملوں کے اثرات باقی ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب 28 حلقوں کو ایک مذہبی شناخت کی بنیاد پر منفرد طرز نمائندگی مل جائے گا تو باقی 244 حلقے اپنے اپنے مسلک کی مذہبی شناخت کو نمایاں کرنے کی آزمائش سے کیوں کر باز رہیں گے۔ جب ان کا شوق پورا نہیں ہوگا تو پھر ان کے لیے کون سا طرز انتخاب تجویز کیا جائے گا۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ قومی اسمبلی کے وہ باقی 244 حلقے جن میں بہر حال 15 لاکھ کے قریب اقلیتی ووٹر ہیں گے اُن کو مجوزہ سیاسی نمائندگی اور تحفظ وغیرہ کی ضرورت کیوں پیش نہیں آئے گی۔

پاکستان میں بسنے والی مذہبی اقلیتوں کی بانوے فیصد آبادی ہندو یا مسیحی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اور مذہبی شناخت پر سیاسی نمائندگی کے مجوزہ کلیے کے مطابق قومی و صوبائی اسمبلیوں میں انہی دو برادریوں کے افراد کے جیتنے کا امکان ہے لہذا اس تجویز کو مان لیں تو پارسی، سکھ، بہائی، بدھ مت اور دیگر مذہبی اقلیتوں کے قانون ساز اداروں میں جگہ پانے کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔

حالیہ طرز انتخاب میں یہ امکان تو ہے کہ وہ مذہبی اقلیتیں جو تعداد میں انتہائی کم ہیں ان سے تعلق رکھنے والے افراد بھی سیاسی ایوانوں / سیاسی عمل کا حصہ بن سکتے ہیں۔ اگر اس تجویز کو مان لیں تو خاص طور پر بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں بسنے والی مذہبی اقلیتوں کے لیے ایوانوں کے دروازے بند ہوتے نظر آئیں گے کیونکہ 95 فیصد اقلیتی آبادی پنجاب اور سندھ میں آباد ہے۔

باری صاحب نے اپنے مضمون میں ایک تجزیہ پیش کیا ہے اور یہ اعتراف تو درست ہے کہ 1985ء کے بعد قومی و صوبائی اسمبلیوں کی اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستوں میں اضافہ نہیں کیا گیا حالانکہ صوبائی اسمبلیوں اور قومی اسمبلی کی جنرل نشستوں میں اضافہ کیا گیا ہے لہذا اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستوں میں بھی اضافہ ہونا چاہیے تھا لیکن اس تجزیہ میں یہ بات نظر انداز کر دی گئی کہ 2013ء سے 2018ء کی ٹرم میں کم از کم چار ایوانوں میں مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے نمائندگان کی تعداد آئین میں مقرر کردہ نشستوں سے زیادہ ہے مثلاً سینٹ میں چار کی بجائے چھ سینیٹر ہیں، قومی اسمبلی میں دس کی بجائے تیرہ، پنجاب اسمبلی میں آٹھ کی بجائے گیارہ اور سندھ اسمبلی میں نو کی بجائے دس نمائندگان ہیں۔ گویا سیاسی عمل میں مذہبی اقلیتوں کے لیے کشادگی پیدا ہونے کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مذکورہ تجاویز میں حالیہ نظام کی جن کامیابیوں کو نظر انداز کیا

گیا ہے وہ کوئی معمولی بھی نہ تھیں۔ شاید احباب مذہبی اقلیتوں کی براہ راست نمائندگی کو زیادہ اہم خیال کرتے ہوئے مخلوط طرز انتخاب میں پائی جانے والی حقوق کی برابری کی اہمیت پر توجہ نہیں کر پائے۔ اُن کا خیال ہے کہ نمائندگی براہ راست اور مذہبی اقلیتوں کے نمائندوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو پاکستان میں تکثیریت اور مذہبی تنوع کی منزل آسانی سے مل جائے گی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان جیسے ملکوں میں جہاں پر جمہوریت کمزور، سماج میں صنف، علاقہ اور مذہب وغیرہ کے حوالے سے نا برابری پائی جاتی ہے۔ اور وہاں مخصوص نشستوں کے نظام کے لیے ایسی تجاویز سیاسی نظام کا حصہ تو بنائے گئے ہیں مگر یہ متعصبانہ سماجی رویوں کی درستی اور سیاسی نظام کی اصلاح کا سبب نہیں بن سکے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اگر پسماندگی کو دور کرنے اور نا برابری کو ختم کرنے کا کوئی طریقہ کار نظام کی مستقل ضرورت بن جائے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ نظام اپنے مقاصد میں ناکام ہو گیا ہے یعنی پسماندگی دور نہیں ہو رہی یا پھر یہ طریقہ سیاسی نظام میں اداراتی امتیاز کا حصہ بن گئے ہیں۔

پاکستان کے سیاسی سماجی حقائق، جمہوری اصولوں کی پاسداری اور مذہبی اقلیتوں کا تحفظ ان تمام مقاصد کا حصول پیش نظر رکھا جائے تو سب سے پہلی کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ وہ طرز انتخاب اپنایا جائے جس میں سماجی، سیاسی و مذہبی یگانگت کے اسباب پیدا ہونے کا امکان زیادہ ہو، خصوصاً مذہبی تعصبات کے خاتمے کی سبیل موجود ہو۔ پاکستان میں اکیس برس تک جدا گانہ طرز انتخاب رائج رہا جس میں ووٹر صرف اپنے ہم مذہب امیدواروں کو ووٹ دینے کے مجاز تھے۔ اس نظام کے تحت دو بلدیاتی اور پانچ عام انتخابات ہوئے، جو مذہبی امتیاز اور مذہبی انتہا پسندی کے لیے سازگار فضا بنانے میں کام آئے۔ اور پھر مذہبی تفریق کا بیج ہر صحن کی کیاری میں بودیا گیا جس کی جڑی بوٹیاں تلف کرنا آج مشکل ہو رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کی حالت پتلی ہے اور سماجی انصاف کے کلیے کو مد نظر رکھتے ہوئے آئینی، سیاسی اور خصوصی تحفظ کی ضرورت ہے۔ مذہبی اقلیتوں کی معاشی حالت نے حکومت کو یہ احساس دلایا کہ سرکاری ملازمتوں میں مذہبی اقلیتوں کا کوٹہ مخصوص ہونا چاہیے۔ دیگر ملکوں میں بھی ایسے اقدامات حقوق کی برابری کو ممکن بنانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کئی مغربی ممالک میں اقلیتوں اور تارکین وطن کو سیاسی نظام میں شامل کرنے کا عمل تیزی سے بڑھا ہے۔ جس سے ان معاشروں میں سیاسی استحکام، مذہبی تنوع اور ہم آہنگی کی بنیادیں مضبوط ہوئی ہیں لیکن وہاں پر مندرجہ بالا اہداف نشستی مخصوص کرنے سے نہیں بلکہ سیاسی اتفاق رائے اور شعوری سماجی عمل کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پاکستان میں اگر مذہبی شناخت کی بنیاد پر مخصوص نشستوں کو انتخابی حلقوں تک پھیلا دیا جائے۔ مختلف جغرافیائی اکائیوں کو ایک نئی مذہبی شناخت مل جائے تو ایک مرتبہ پھر ان حدود سے باہر رہنے والے لوگ کسی نئی شناخت کے سفر پر نکل پڑیں گے۔ ممکن ہے یہ شناخت کسی مذہب، مسلک سے آگے بڑھ کر کوئی بھیا تک شکل اختیار کر لے۔

خصوصی اقدامات کی ضرورت سے انکار نہیں لیکن یہ بھی یاد رکھا جائے کہ پاکستان میں پسے ہوئے، پچھڑے ہوئے، کمزور طبقات کے حقوق کا احترام اور تحفظ اس بات سے مشروط ہے کہ فرد کی آزادی اور جمہوری اصولوں کا احترام بھی ہو۔ جتنا کمزور جمہوری نظام ہوگا اتنا ہی مذہبی اقلیتوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کی ضمانت دینا مشکل ہوگا۔ یہ بھی تسلیم کہ پاکستان میں حقیقی جمہوری نظام اور جمہوری اداب کو رواج دینے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ لیکن یہ ممکن بنانے کے لئے انتخابی نظام کو غیر ضروری پیچیدگیوں سے بچانا بھی ہے۔ خاص طور پر وہ تجاویز جن کے منفی اثرات معلوم اور نتائج مشکوک ہیں۔ طرز انتخاب کی بحث میں جدا گانہ انتخاب کا تجزیہ اور الیکشن ایکٹ 2017 کے ضمن میں پیدا ہونے والے بحران کو سامنے رکھیں تو کوئی ایسی تجویز جو سیاست اور تمدن میں پائے جانے والی مذہبی تقسیم کو گہرا کر دے، اس سے اجتناب ضروری ہے۔

تمام ایسے ساتھی جو انسانی حقوق اور عوام کی حاکمیت کی جدوجہد کر رہے ہیں انہیں سکڑتی زمین اور کھلتے ہوئے آسمان دونوں سے واسطہ ہے۔ امید ہے وہ کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کریں گے۔

نوٹ: یہ مضمون ’ہم سب‘ ڈاٹ کام پر 2 دسمبر 2017 کو شائع ہوا۔

042-36661322

info@csjpak.org

www.csjpak.org

Centre for Social Justice

@csjpak

فون نمبر:

ای میل:

ویب سائٹ:

فیس بک:

ٹویٹر:

ادارہ برائے سماجی انصاف

E-58، گلی نمبر 8، آفیسرز کا لونی، والٹن روڈ، کینٹ، لاہور

